مطالعہ کرسکیں، مساجد کی اجتماعی اہمیت پر بحث ضروری ہے، اور یہ کہ اس زمانے میں امام مسجد کس حیثیت کا ہونا چاہیے، شریعت میں اس منصب کی کیا اہمیت ہے، عہد مشہود لہا بالخیر میں مساجد سے کیا کام لیا جاتا تھا، مساجد کا قدرتی اجتماع کس قدر نتیجہ خیز ہو سکتا ہے، یہ اور اس طرح کے بہت سارے عنوانات ہیں، جن پر مختصر اور جدید انداز میں کلام کی ضرورت ہے" (مکتوب ۲۹ر اپریل ۱۹۴۶ء)

غور کیا جائے حضرت مفتی صاحب اپنے ایک خُرد کے خط میں تصنیف و تالیف سے متعلق کس قدر کارآمد اور ضروری چیزیں لکھ کر متوجہ کر رہے ہیں، کہ مصنف و مؤلف کو کن چیزوں پر دھیان دینے کی ضرورت ہے، خاکسار نے صرف اپنے کام کا تذکرہ کیا تھا۔ اور آپ بطور خود معاون کتابوں کی نشاندہی بھی فرما رہے ہیں اور تقاضائے زمانہ اور ضروری مباحث کی طرف اشارہ بھی فرما رہے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کا نظام مساجد نامی کتاب میں ان تمام چیزوں کی رعایت بھی موجود ہے اور ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کی نظر علوم پر گہری و وسیع تھی، اور ان پہلوؤں کو ابھارنا ضروری سمجھتے، جن کی طرف عام مولویوں کی نظر نہیں جاتی ہے، اس کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ وہ گو مصنف نہیں تھے مگر مصنف گر ضرور تھے، تو اس میں کیا مبالغہ ہے، اسی طرح اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور علمی رہبری کا خاص ذوق رکھتے تھے اور نوجوان عالمان دین کے سوتے ہوئے علمی جذبات کو ابھارنے کا ملکہ تامہ رکھتے تھے۔

نظام مساجد کا مسودہ جب خاکسار نے مکمل کر لیا، تو کوئی ایسا بے تکلف عالم نہیں ملا، جو میری پہلی علمی کاوش پر صحیح معنی میں نظر ثانی کرتا، میرے اپنے اساتذہ ضرور تھے اور وہ علمی دنیا اور تصنیف و تالیف کے میدان کے شہسوار بھی تھے، مگر ایک شاگرد کی اس زمانہ میں کہاں ہمت ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی پہلی کتاب کو ان کے سامنے پیش کرتا اس کے لیے بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے مشورہ طلب کیا، اس لیے کہ وہ میرے علمی کاموں سے برابر

دلچسپی لے رہے تھے، مفتی صاحب نے یہاں بھی رہنمائی فرمائی، خط کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

"گرامی نامہ ملا۔ نظام مساجد کی تکمیل سے مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مقبول ونافع فرمائے، ترتیب مضامین اور زبان کے لحاظ سے قاضی زین العابدین صاحب محلہ اندرکوٹ میرٹھ شہر کی نظرثانی مفید رہے گی، میرے حوالے سے ان کو لکھیے اور حق المحنت بھی طے کر لیجئے"، میٹریل (مواد) کے پیش نظر مولانا محمد ادریس صاحب ادارہ شرقیہ جامع مسجد دہلی کی نظرثانی بہتر رہے گی، اُن سے خط وکتابت کیجئے"، یہ دونوں بھی کسی نہ کسی درجہ میں ندوۃ المصنفین سے بھی وابستہ ہیں، رفقائے خاص میں کسی کو فرصت نہیں، معمولی مشورہ کے لئے ہم سب حاضر ہیں۔" (مکتوب ۷؍جولائی ۱۹۴۷ء)

یہ وہ زمانہ تھا کہ ان میں سے کسی سے نہ ملاقات تھی، اور نہ دید شنید، البتہ قاضی صاحب کی خلافت راشدہ ضرور پڑھ چکا تھا، بڑی مایوسی ہوئی، کہ اس قدر دور دراز سے رشتہ کس طرح جوڑا جائے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تین مہینے بحیثیت طالب العلم گذار کر میں نگرام آیا تھا، مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے میری جان پہچان تھی کہ وہ بھی اس زمانہ میں ندوہ کے استاذ تھے، اس مایوسی میں ایک لمبا خط مولانا ندوی کے نام لکھا، اور اس میں علماء کی سست رفتاری، کام چوری اور بخل علمی کی خوب خوب شکایتیں لکھیں اور نظام مساجد پر نظرثانی کے سلسلہ میں جن مرحلوں سے گذر رہا تھا اس کی تفصیل بھی لکھی، اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے، واپسی ڈاک سے جواب لکھا اور حوصلہ افزا کلمات سے نوازا، یہ بھی لکھا کہ آپ نے علماء کی جو شکایتیں اپنے خط میں لکھی ہیں، بالکل یہی شکایتیں مجھے بھی ان سے تھیں، جب میں تمہاری عمر میں تھا، لہٰذا تم اپنا کام کرو، کام کرنے سے کام کی راہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں، اخیر میں لکھا جب تم ادھر آنا تو وہ مسودہ ساتھ لیتے آنا، انشاءاللہ میں اسے دیکھوں گا، چنانچہ میں لے کر حاضر ہوا، مولانا نے دو ہفتے اپنے پاس مسودہ رکھا

اس کا ایک ایک حرف پڑھا، باضابطہ تصحیح فرمائی، البتہ اخیر والے حصہ میں سرسری طور پر پڑھ کر حاشیہ پر اپنی رائے لکھتے گئے کہ اسے اس طرح کرلینا۔

دو ہفتے کے بعد جب پھر حاضری ہوئی تو مسودہ پر مولانا کی تصحیح دیکھی، اس وقت مجھے کتنی مسرت ہوئی، بیان نہیں کرسکتا کہ ایک عالم دین تو ایسا مخلص ملا۔ وہ دن ہے آج تک ان کو اپنا استاذ جانتا ہوں، اور یقیناً تصنیف و تالیف کے میدان میں وہ میرے شفیق استاذ ہیں، اور پھر بٹھا کر تصنیف و تالیف سے متعلق بہت ساری باتیں بیان فرمائیں کہ کن چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔

درمیان میں یہ ضمنی بات آگئی، عرض کر رہا تھا کہ حضرت مفتی صاحب میں اپنے خردوں اور چھوٹوں کو بڑھانے کا بہت خیال تھا، اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی دلّی پھر ایک بار لُٹی، جلی، اُس زمانہ میں خط لکھ کر مفتی صاحب کے حالات معلوم کرنے کی سعی کی، مفتی صاحب کا جواب موصول ہوا۔ وہ پورا خط بھی ملاحظہ کیا جائے۔

مخلص مکرم مولوی ظفیر الدین صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کرم نامہ ملا۔ یاد آوری کا دلی تشکر یہ، الحمد للہ ہم سب زندہ سلامت ہیں، اور قرول باغ میں جو کچھ گذر چکا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے، زندہ بچ نکلنا ہی حق تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے، مطبوعات کا تمام قابل ذکر ذخیرہ خاکستر ہو چکا ہے، کچھ حصہ جو دفتر میں رہتا تھا ضرور بچا ہے، بعض کتابیں جو پریس میں تھیں، اگر وہ تیار ہو گئیں، تو وہ بھی بچ گئیں، کوشش یہی ہے کہ "برہان" جنوری سے جاری ہو جائے، لیکن دہلی کی فضا میں آثار سکون کے بعد پھر تلاطم سا معلوم ہوتا ہے، ادھر اُجڑے اور لٹے ہوئے کام کے سرے ملانا بھی کچھ ایسا سہل نہیں ہے، اس لیے ہو سکتا ہے، جنوری کے بجائے فروری سے اشاعت شروع ہو۔" (مکتوب ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۷ء)

ان حالات میں نظام مساجد کی طباعت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، خاکسار خود بھی

نگرام ضلع لکھنؤ سے منتقل ہو کر انہی حالات کی وجہ سے سانحہ ضلع مونگیر دارالعلوم معینہ میں آگیا، اور کیسے لکھنؤ سے بچ بچاکر وطن آیا، ایک لمبی داستان ہے۔ سانحہ ایک دیہاتی قصبہ تھا۔ دو سال بعد جب مولانا گیلانی سے جان پہچان ہوئی، اور یہ مسودہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا تو فرمایا کہ اس کے چھپوانے کی سعی کرو۔ مفتی صاحب کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آیا، میں نے سانحہ ضلع مونگیر سے اپنے خط میں اس نظام مساجد کی طباعت کا تذکرہ کیا، دہلی سے جواب آیا۔

"کتاب کی تکمیل سے مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کی محنت ٹھکانے لگائے۔ اور کتاب جلد طبع ہو جائے، ندوۃ المصنفین کے کاموں کا شیرازہ ابھی تک بکھرا ہوا ہے، اس کی اپنی بہت سی مطبوعات ناپید ہیں، جن پر ادارے کی بقا کا مدار ہے یہی وجہ ہے اب تک ۱۹۴۸ء و ۱۹۴۹ء کی کتابیں بھی شائع نہیں ہوسکیں، بحالت موجودہ آپ کی گراں قدر تالیف کی اشاعت کی یہاں سے کوئی صورت نہیں ہے، البتہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے آپ اس کا کوئی باب "برہان" میں شائع کرنے کے لیے دے سکتے ہیں" (مکتوب: ۳۰ر مئی ۱۹۴۹ء)

اس زمانہ میں مفتی صاحبؒ کا یہ جواب بھی بہت غنیمت معلوم ہوا، ملک کی تقسیم کے بعد جو حالات رونما ہو چکے تھے بالخصوص دہلی جس طرح برباد ہو چکی تھی، ندوۃ المصنفین اور اس کے رفقاء کار کا بچ جانا اور پھر کاموں کے شروع کرنے کا عزم بڑی بات تھی۔

یہاں اس کا تذکرہ مناسب ہوگا کہ جب خاکسار نے حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ جواب سنایا تو فرمانے لگے کہ دو آدمیوں کی عزیمت سے میں بہت متاثر ہوا، ان میں ایک مفتی صاحبؒ کے متعلق فرمایا کہ ۱۹۴۷ء میں ندوۃ المصنفین کا سرمایہ جب لٹ گیا اور کلکتہ میں مدرسہ عالیہ کا از سرِ نو افتتاح ہوا، تو اس کے لیے مولانا آزاد نے دہلی سے علماء کرام کی ایک ٹیم بھیجی، مولانا فرماتے تھے میں نے مفتی صاحب کو لکھا کہ اچھا یہ ہے کہ

آپ بھی بحیثیت استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ تشریف لے جائیں، اس کے جواب میں انھوں نے لکھا، میں بڑی آسانی سے جا تو سکتا ہوں، مگر مجھے ملازمت کرنا نہیں ہے، مجھ سے جیسے بھی بن پڑے گا اپنے اس ادارے کو چلانے کی جدوجہد کروں گا، مولانا گیلانی فرماتے تھے جن حالات سے وہ گذر رہے تھے، ان میں یہ حوصلہ لائق مدح و ستائش ہے، واقعی یہ ان شاء اللہ کام کر جائیں گے، اور ادارہ ندوۃ المصنفین کامیاب رہے گا۔

مفتی صاحب کی طلب پر خاکسار نے نظام مساجد کا ایک باب نقل کرکے بھیج دیا، تاکہ اس بہانہ سے کتاب کا قبل از وقت تعارف ہو جائے گا، اور اہل علم کی نظر میں اس کتاب کی اہمیت سما جائے گی، یہاں بکس میں بند رہنے کا آخر فائدہ کیا ہوگا، مضمون ملتے ہی جواب آیا۔

"مضمون ان شاء اللہ اگست کے برہان میں شریک اشاعت ہوگا، ابھی مسودے پر نظر نہیں ڈال سکا، بشرط فرصت دیکھوں گا، خدا کرے آپ کی محنت مثمر ہو، اور مسلمانوں کو اس سے نفع پہونچے، مسودے کی اگلی قسط بھی بھیج دیجیے، پورا مضمون سامنے ہوتا ہے تو اشاعت کے لیے توازن قائم کرنے میں سہولت ہوتی ہے، اس نازک اور مشکل وقت میں جو کام بن آئے، غنیمت ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سروسامان کے انتظار میں اصل کام ہی رہ جاتا ہے، بہت اچھا ہوا کہ ایک مفید اور علمی اور اصلاحی خدمت سامنے آگئی۔" (مکتوب ۴ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ ۲ جولائی ۱۹۴۹ء)

الحمد للہ اس کے بعد نظام مساجد کی متعدد قسطیں برہان میں آئیں، اور قارئین نے اس سلسلہ کو پسند کیا اور خود مفتی صاحب نے بھی اس سے دلچسپی لی، اور بلاشبہ ان قسطوں کے شائع ہونے سے میرا حوصلہ بھی بڑھا اور مجھ میں توانائی بھی آئی۔

مفتی صاحب نے بڑی دوراندیشی کی بات لکھی تھی، اس کا تجربہ بہت بعد میں اس وقت ہوا جب کہ کئی کتابوں کے مسودات جو میں تیار کرکے رکھے ہوئے تھا کہ اس پر کچھ اور

کام ہو جائے تو طباعت کا انتظام کیا جائے گا، مگر ناگہانی طور پر ایک وقت ایسا آیا کہ یہ سارے مسودات لُٹ گئے اور دوسرے لے جانے والے مال غنیمت سمجھ کر میرے غائبانہ میں لے بھاگے، اور اس طرح میری سالہاسال کی محنت ضائع گئی، بلکہ زندگی بھر کا سرمایہ جاتا رہا۔

انہی مسودات میں تاریخ مساجد کا قیمتی مسودہ بھی تھا جس پر کم وبیش بیس سال میرے صرف ہوئے تھے، پوری دنیا کی تاریخی مسجدوں کا تذکرہ جمع اور یکجا کرنے کی سعی کی گئی تھی، کئی سو مسجدوں کا حال آگیا تھا، جس میں مصر، شام، بیت المقدس، حرمین محترمین، افریقہ، اندلس، ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ممالک کی تاریخی مسجدوں کا تذکرہ کتابوں کے حوالہ کے ساتھ میں نے یکجا کیا تھا۔

یہ کام خاکسار نے حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے کیا تھا، کام شروع کرنے کے زمانہ میں مفتی صاحب نے لکھا کہ نظام مساجد کے بعد تاریخ مساجد پر کام شروع کر رکھا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا:

"موصوف (مولانا گیلانی) نے خدمت (تاریخ مساجد) بھی اچھی تجویز کی ہے، اس کام کے لئے آپ کو تاریخ مکہ وفاء الوفاء سمھودی، تاریخ مدینہ منورہ، اردو میں اخبار الاندلس، اور آثار الصنادید بڑی کتابوں میں خطیب بغدادی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے، ان کتابوں میں مختلف ممالک کی مساجد کے بکھرے ہوئے حالات ملیں گے بہرحال کام شروع کیجئے قدرت مدد کرے گی۔" (مکتوب یکم اگست ۴۹ء)

دیکھ رہے ہیں مفتی صاحب کی نظر کہاں کہاں پہونچی ہوئی ہے، اور آپ کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، اور حوصلہ افزائی کا انداز کتنا پیارا اور دلکش ہے، یہ واقعہ ہے کہ مفتی صاحب کا ذوق مصنف بنانے کا بڑا ہی عمدہ اور بہتر تھا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ماشاء اللہ آپ کا قلم شدہ شدہ پختہ سے پختہ تر ہوتا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے وجود کو ملت کے لیے نافع بنائے۔" (مکتوب ۸ رمئی سنہ ۱۹۵۰ء)

ایک نوجوان مدرس جو درس و تدریس کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ مقالہ نویسی یا تصنیف و تالیف کا معمولی کام کر رہا ہو، اور وہ ایک قصباتی مدرسہ کا معلم ہو، اس کے لیے ندوۃ المصنفین دہلی کے بانی و ناظم کے قلم سے یہ جملے کتنے ولولہ انگیز ہو سکتے ہیں، اندازہ لگانا مشکل نہیں، یہی وجہ ہے حضرت مفتی صاحب سے بڑی عقیدت بھی رہی، اور محبت بھی، ماننا چاہیے میرے علمی محسنوں میں حضرت مفتی صاحب بھی شامل تھے۔

میری طرح اس وقت ملک میں دوسرے بھی کتنے نوجوان ہوں گے جن کی مفتی صاحب نے حوصلہ افزائی کی ہوگی، اور اس کی صلاحیت کو اجاگر کیا ہوگا، اور میرے علم میں ہے کہ ندوۃ المصنفین جس نے کتنے ہی گمنام کو شہرت علمی بخشی ہے اور ان کی کتابیں شائع کر کے مصنف بنا دیا ہے، اور ان کا اہل علم میں ایک معیار قائم کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مفتی صاحب علماء کی جماعت میں اپنی آپ مثال تھے، تعمیری ذہن و فکر کے مالک تھے، تخریب سے کوسوں دور تھے، اور سراپا اخلاص تھے، علماء میں ایسے افراد نایاب نہیں تو کمیاب یقیناً ہیں، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ ہمارا طبقہ تنگ نظری، اور تنگ دلی میں بدنام ہے، اور یہ بدنامی بلا وجہ نہیں ہے۔

لیکن اسی جماعت کے ایک فرد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی تھے، جو سنگ ریزوں کو گہر بنانے کا فن جانتے تھے، اور خذف کو گوہر شاہوار کر دیا کرتے تھے، یہ درست ہے کہ وہ مالی مدد نہیں کرتے تھے کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں تھا، مگر علمی رہنمائی، علم نوازی، اور ذی استعداد علماء کی قدردانی کا خاص ذوق رکھتے تھے، اور اس میدان میں بے مثال تھے، آپ مردم شناس بھی تھے اور مردم ساز بھی، بلکہ شخصیت سازی میں بہت سے لوگوں سے بہت آگے تھے۔

پرانے علماء بیان کرتے ہیں کہ یہ خوبی مفتی صاحب کے چچا سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی میں بدرجہ اتم تھی، اپنے دورِاہتمام میں کسی ہونہار فاضل دیوبند کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

ایک خط میں مفتی صاحب نے خاکسار کو لکھا۔

"تاریخ مساجد کا کام بھی کر ڈالیے، جو کام آپ کے اختیار کا ہے، وہ تو ہو جائے"

مجھے حیرت ہے ملک انقلاب سے دوچار تھا، دہلی تاراج ہو رہی تھی، اور مفتی صاحب اپنے کام سے اس وقت بھی غافل نہیں ہوئے، ایک طرف مجاہد ملّت کے ساتھ مسلمانوں کے تحفظ و بقا اور ان کو بسانے کی فکر میں منہمک تھے اور دوسری طرف ندوۃ المصنفین اور اپنے متعلقین سے بھی بے فکر نہیں تھے، اپنے ایک خط میں خاکسار کو یہ بھی لکھا۔

"خدا کرے نظام مساجد کی اشاعت کا جلد کوئی سامان ہو جائے، مجھے اس کا بہت خیال ہے، مسوّدہ جلد بھیجنے کی فکر کیجئے، جہاں جہاں مناسب اختصار ہو، ہو جانا چاہیے، نظرِ ثانی کے وقت تعبیر و بیان میں بھی معتدبہ فرق ہو جایا کرتا ہے، یہ چیز بھی سامنے رہنی چاہیے، کسی جگہ بیان کا کوئی حصّہ مکرر نظر آئے تو اس کو حذف کر دینا بہتر ہے مقصد یہ ہے کہ کتاب کا انداز بیان بھرپور ہو، اور جامع و مختصر بھی"

(مکتوب ۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

ان حوصلہ افزا کلمات کے بعد کون ایسا مصنف ہو گا، جو کوتاہی سے کام لے گا، اور اس وقت اور بھی جب وہ مصنف نوجوان ہو، اور اپنی محنت کو منظر عام پر لانے کا متمنی ہو، چنانچہ خاکسار نے ان ہدایات کی روشنی میں بعجلت تمام نظر ثانی کر کے مسودہ مفتی صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا، اور انھوں نے اس کی کتابت شروع کرا دی اور چند ماہ کے بعد خوشخبری سنائی۔

"نظام مساجد کے پروف آرہے ہیں، کاغذ کی کمیابی نے پریشان کر رکھا ہے۔

تھوڑے کا غذ کا بندوبست ہو گیا ہے، توقع ہے اس مہینہ کے آخر تک کتاب تیار ہو جائے گی، والامر بید اللہ تعالیٰ"

اسی خط میں یہ بھی لکھا۔

"جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دام مجدہم السامی کے علم وفضل اور تقدس وتقوی سے ہم سب ہمیشہ متاثر ہیں، مولانا کے تعلق سے آپ سے اور بھی خصوصیت ہو گئی" (مکتوب ۶ مارچ ۱۹۵۱ء)

یہ واقعہ ہے کہ استاذ کی نسبت ہر جگہ کام آتی ہے حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کا ہی فیض ہے کہ خاکسار مدرس بنا، مفتی بنا، مصنف بنا اور مقالہ نگار ومضمون نویس بنا، اخلاق واعمال پاکیزہ رہے، اور عقاید میں پختگی رہی، الحمد للہ حضرت الاستاذ مدظلہ کا سایۂ عاطفت اب تک خاکسار پر سایہ فگن ہے اور جب کبھی کوئی مصیبت آئی، مجھ سے زیادہ حضرت مولانا کو فکر ہوئی، اللہ تعالیٰ بہت دیر تک آپ کا سایہ قائم رکھے۔

اس کے چند ہفتوں کے بعد خوشخبری دی گئی کہ کتاب نظام مساجد چھپ کر تیار ہو گئی۔ مفتی صاحب نے لکھا:

"یہ معلوم کر کے آپ کو خوشی ہو گی کہ نظامِ مساجد چھپ گئی، آج موڑائی شروع ہوئی ہے، زیادہ سے زیادہ دس روز میں جلد بندی ہو جائے گی، لکھیے آپ کو کتنے نسخوں کی ضرورت ہے، روانہ کر دئے جائیں گے" (مکتوب یکم اپریل ۱۹۵۱ء)

مجھے یہ دکھانا تھا کہ مفتی صاحب کا علمی ذوق کتنا عمدہ تھا، اور اپنے ملنے والوں سے نہیں، بلکہ اجنبی اور غیروں سے علمی خدمت کے نام پر کیسا بزرگانہ برتاؤ رکھتے تھے، اور اس کی دل دہی میں کتنے سرگرم تھے، اور ندوۃ المصنفین کے کاموں میں کیسی مستعدی پائی جاتی تھی، میرا اندازہ ہے، مفتی صاحب کے چند خطوط سے ان چیزوں کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی ہو گی۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ خاکسار مفتی صاحب کے لیئے قطعاً اجنبی تھا، دید شنید تک نہیں تھی، مگر ہر قدم پر ان کی رہنمائی سامنے آتی رہی، انھوں نے نظام مساجد بہت عمدہ چھاپی اور اس کے نسخے خاکسار کے نام روانہ فرمائے۔

اس کتاب کے بعد نظام عفت وعصمت کے کئی ابواب مسلسل برہان میں چھپے اور وہ مستقل کتاب بھی بعد میں ندوۃ المصنفین سے ہی آب وتاب سے شائع ہوئی، اور یقیناً یہ سب مفتی صاحب کی علم دوستی تھی اور ساتھ ہی ذرہ نوازی بھی۔

مفتی صاحبؒ کی نظر فقہ پر وسیع بھی تھی اور گہری بھی، وہ عرف زمانہ کو بھی نظرانداز کر کے نہیں سوچتے تھے، ان کا ذہن بند نہیں تھا، کھلا ہوا تھا، مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ میں بارہا خاکسار نے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے، دارالعلوم معینیہ سانحہ کے زمانۂ قیام میں خاکسار نے "جلکر" (پانی میں مچھلی فروخت کرنے کے) متعلق دریافت کیا۔ تو جواب میں تحریر فرمایا۔

"استفسار کا مختصر جواب یہ ہے کہ "جلکر" کی وہ صورت جسے فقہاء بیع السمک فی الماء سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے، البتہ یہ ظاہر ہے کہ بیع فاسد، مفید ملک ہے اور چونکہ یہاں معاملہ مدرسہ کا ہے، کسی کی ذات کا نہیں، اس لیے بیع فاسد سے حاصل شدہ رقم ضروریات مدرسہ پر خرچ کی جاسکتی ہے، یہ رقم اگر کسی شخص کی ملک میں ہوتی تو اس کا صدقہ دینا ضروری ہوتا، یہاں خود مدرسہ تصدق کا بہت اچھا مصرف موجود ہے، نفس عقد کے جواز کے لیئے اصل معاملے میں ترمیم کی ضرورت ہے، مثلاً تالاب کو اجارے پر دے دینا، اب اجارہ پر لینے والا خواہ اس سے مچھلیاں حاصل کرے، یا سنگھاڑے کی بیل ڈالے، یا کوئی اور کام کرے، نفس عقد میں تھوڑی ترمیم اور ردوبدل کے بعد جواز کی صورت نکل سکتی ہے، لیکن اس کے لیے بالمشافہہ گفتگو کی ضرورت ہے، فتویٰ کی حیثیت میں ان کو سامنے نہیں رکھا جا سکتا" (مکتوب ۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اسی طرح ایک خط میں خاکسار نے "قنوت نازلہ" کے باب میں مفتی صاحب کی رائے دریافت کی، تو مفتی صاحب نے اپنے جوابی خط میں دیگر چیزوں کے ساتھ قنوت نازلہ پر بھی اپنی رائے لکھ بھیجی، تحریر فرمایا:

"قنوت نازلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو تو زبانی ہی ہو سکتی ہے، خلاصہ بہر حال آپ کے ہی دماغ میں ہے۔

احناف کے سب سے بڑے ترجمان امام طحاویؒ اس کے قائل ہیں کہ قنوت نازلہ تمام جہری نمازوں میں نہیں، صرف فجر کی نماز میں پڑھی جائے گی اور وہ اس کو امام ابی حنیفہؒ کا مسلک قرار دیتے ہیں، الفاظ قنوت نازلہ مختلف حدیثوں میں ملتے ہیں، آپ جن الفاظ کو موجودہ حوادث اور اسلام کی عام تعلیمات کے زیادہ قریب خیال کرتے ہیں، منتخب کر لیجیے، جہاں تک میرا تعلق ہے ذہن ادھر ہی جاتا ہے کہ قنوت نازلہ صرف اس وقت پڑھنی چاہیئے کہ مسلمانوں کا کوئی طائفہ دشمن کے مقابلہ میں مصروف قتال ہو، اور دشمنوں کے نرغہ میں گھر گیا ہو، ہاتھ باندھنا میرا ابھی معمول نہیں ہے، قنوت نازلہ میں ہاتھ باندھنا، مجھے تو خلاف سنّت معلوم ہوتا ہے، سمع اللہ لمن حمدہ، ربنا لک الحمد کے ساتھ اگر کچھ مزید دعائیں بھی کسی وجہ سے پڑھی جائیں، تو ان میں ہاتھ باندھنے کا کیا مطلب ہے، اس مسئلہ میں بعض بزرگوں کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے، اور انھوں نے اسے امام ابی حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مشہور و معروف اختلاف کے سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ حالانکہ قنوت کی دعاؤں سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ہاتھ چھوڑ کر پھر قنوت کے لیے ہاتھ باندھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حضرت والد ماجدؒ (مفتی عزیز الرحمن عثمانی مدظلہٗ) کا بھی یہی مسلک تھا" (مکتوب ۸ مئی سنہ ۱۹۵۰ء)

حضرت مفتی صاحبؒ حالات زمانہ کو سامنے رکھ کر جب مسائل پر بولتے تھے، تو سننے والوں کے ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جاتی تھیں، اور اندازہ ہوتا تھا کہ مفتی صاحبؒ